© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

خرّم مراد

اس سال کا بجٹ پیش کرنے کی "سالانہ رسم" ادا کی جا چکی ہے۔ بجٹ صرف آمد و خرچ کی جمع تفریق کا نام نہیں' نہ یہ صرف اعداد و شمار کا گورکھ دھندا ہوتا ہے۔ اسے تو ملک کے روشن مستقبل اور عام آدمی کے لیے بہتر زندگی کی طرف پیش رفت کے لیے حکومت کی سوچ' سمت' پالیسیوں اور اقدامات کا حامل اور عکاس ہونا چاہیے۔ ہمیں سب سے بڑھ کر اسی پہلو سے اس بجٹ سے دلچسپی ہے۔

وزیر خزانہ نے صحیح فرمایا ہے کہ "بجٹ میں قوم کے مستقبل کے خوابوں کی تعبیر پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ شیشہ کی ایک ایسی گیند ہے' جو بصیرت رکھنے والے پر ماضی اور حال کے سارے راز عیاں کر دیتی ہے"۔ ہماری بصیرت جو کچھ دیکھ رہی ہے ' اس کی روشنی میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ حالیہ حکومت کا یہ بجٹ' کیسی ہی دھوم دھام سے آیا ہو اور کتنے ہی حسین خوابوں کا یقین دلا رہا ہو' حقیقت یہ ہے کہ اپنی سوچ اور نہج میں ماضی کی کسی بھی حکومت کے بجٹ سے کسی طرح بھی مختلف نہیں۔ اس کا قبلہ وہی ہے' اہداف و ترجیحات وہی ہیں' جو قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے ہر بجٹ کی ' بلکہ ہماری پوری تہذیبی و معاشی زندگی کی صورت گری کرتی رہی ہیں۔ اس شیشہ میں جو خواب صاف نظر آ رہے ہیں وہ بڑے بھیانک ہیں : روز بروز بڑھنے والے کمر توڑ ٹیکس' ہوش ربا گرانی' سود اور قرضوں کا عفریت جو بالآخر ملک کی ساری آمدنی نگل لے گا' آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی سنہری زنجیریں' قومی مقاصد کی مکمل پامالی۔ "گھٹ گئے انسان' بڑھ گئے سائے"' یہاں تک کہ انسان معدوم ہو جائے گا اور ہر سو اندھیرا چھا جائے گا۔

بجٹ کے اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد بھی ' ہمیں یقین ہے کہ تمام وعدوں کے باوجود منی بجٹ کے نوافل ادا کرنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ بجلی کے نرخ بڑھنا تو یقینی ہے' دوسری قیمتیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی قسطوں میں بڑھائی جاتی رہیں گی' انتظامی اخراجات اسراف کی وجہ سے بے تحاشا بڑھتے رہیں گے' اور آمدنی تخمینوں سے کم ہونے کی وجہ سے ترقیاتی منصوبوں میں کانٹا چھانٹی ہوتی رہے گی۔

عام آدمی تو بجٹ کی طرف ایسی خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے شکاری کے جال میں پھنسا ہوا ایک پرندہ اس کے چاقو کی طرف۔ وہ بڑی بے بسی کے ساتھ پھڑپھڑاتا ہے' لیکن جانتا ہے کہ رگِ گلو سے خون کے قطرے ٹپکائے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں' ورنہ وہ "روشن مستقبل کی نوید" سننے کے لیے بھی ترس جائے گا۔ برس ہا برس کے تجربات نے اسے بڑا سیانا بنا دیا ہے۔ "ترقی' روشن مستقبل اور بہتر معیارِ زندگی" کے خوش نما الفاظ کے کھوکھلے پن سے وہ خوب واقف ہو چکا ہے' اور ان کے حوالہ سے اب وہ بجٹ پر نظر ڈالنے کے لیے بالکل تیار نہیں۔

اعداد و شمار اور اصطلاحات کے جس گورکھ دھندے کی زبان میں بجٹ اس کو اچھے مقدر کا مژدہ سناتا ہے وہ بھی اس کے لیے ناقابلِ فہم ہے' اسی طرح جس طرح وہ زبان جس میں دفتر کی فائلوں اور عدالت کے فیصلوں میں اس کے مقدر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ کُل قومی پیداوار (GDP)' فی کس آمدنی (PCI)' شرحِ نمو (rate of growth) جیسے الفاظ سے وہ خوب جانتا ہے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس کو معلوم ہے کہ ہندسوں کے اس سمندر میں وہ صرف ایک ہندسہ ہے' جس کی کوئی حیثیت نہیں' کوئی نام نہیں۔ یہ پیمانے کچھ فی صد گھٹ جائیں یا بڑھ جائیں' اس کے مقدر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

عام آدمی کو بجٹ سے صرف ایک پہلو سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ٹیکس کتنا اور بڑھے گا؟ قیمتیں کتنی اور چڑھیں گی؟ (گھٹنے کا تو سوال ہی نہیں)۔ زندگی کتنی اور مشکل ہو جائے گی؟ اس کے نزدیک بجٹ نہ مستقبل کی صورت گری کا نام ہے' نہ ترقی کے منصوبوں کا' وہ ٹیکس اور صرف ٹیکس لگانے کا' قیمتیں چڑھانے کا' اور عام لوگوں کی جیبوں سے دولت کھینچ کر' کروڑوں اور اربوں کی مقدار میں' ملک کے چند لوگوں اور بیرونی آقاؤں کی جیبوں تک منتقل کر دینے کا نام ہے۔

ہمارے ہر بجٹ کا قبلہ معاشی ترقی رہا ہے۔ پورے عالم میں مغربی طریقہ کے مطابق "معاشی معراج" کے پیچھے جو اندھا دھند دوڑ لگی' اس کے نتیجہ میں' ورلڈ بنک کی ایک رپورٹ کے مطابق: "۳۰ سالہ ترقی کے نتیجہ میں امیر ترین ۱/۵ لوگوں کی آمدنی' ۱/۵ غریب ترین لوگوں سے ۳۰ گنا کے مقابلہ میں ۱۵۰ گنا زیادہ ہو گئی"۔ ہمارے ہر بجٹ نے بھی یہی کرشمہ دکھایا ہے۔

ہر بجٹ سے پہلے عام آدمی کو صرف یہی سوال پریشان رکھتا ہے کہ اب اس کی جیب سے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتنا پیسہ کھینچا جائے گا۔ لیکن اس سال کسی سے بھی پوشیدہ نہ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اخفا' بجٹ سازی کی ایک بڑی اہم روایت رہی ہے۔ اب کے بجٹ ساز اپنے سب راز بجٹ سے پہلے ہی فاش کر چکے تھے۔ رہی سہی کسر وزیر اعظم نے پوری کر دی جب انھوں نے وزیر خزانہ کی تقریر سے ایک دن پہلے ٹی وی پر اپنی بجٹ اسپیچ پیش کرنے کی نئی روایت ڈالنا ضروری سمجھا۔ پھر اگر اخبار والے بھی ایک دن پہلے ہی بجٹ لے اڑے تو اس پر اعتراض کی کیا گنجائش۔ اس پیشگی انکشاف سے کوئی نقصان تو نہ ہوا' ہاں' حکومت کی اپنے راز کو راز رکھنے کی اہلیت ضرور مشتبہ ہو گئی۔

اس سال بڑی چابک دستی سے لوگوں کو غیر معمولی خوف و حزن اور یاس و ہراس میں بھی مبتلا کیا گیا۔ یہاں تک کہ بجٹ سے قبل لوگوں کے ذہن و دل ٹیکس کے خوف کے علاوہ ہر خوف سے خالی ہو چکے تھے۔ اس ٹیکنیک کے نتیجہ میں کتنے لوگ نفسیاتی مریض بن گئے ہوں گے' ابھی اس کا حساب ممکن نہیں۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ لوگ فوری شدید جھٹکے سے بچ گئے' اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ گولی اتنی کڑوی بھی نہ نکلی۔ وزیر خزانہ نے بھی لوگوں کو فوری شاک سے بچانے میں بڑا کام کیا۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بجٹ تقریر کو حقائق سے خالی رکھا' لوگوں کو آگاہ کرنے کے بجائے غافل رکھنے کا اہتمام کیا' اور انھیں پتا ہی نہ چلنے دیا کہ وہ ان کی جیبوں پر کہاں اور کتنا ہاتھ مار گئے۔ سب سے بڑا نیا ٹیکس سیلز ٹیکس ہے۔ ان کی تقریر میں کچھ ذکر نہیں کہ کس پر کتنا لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب حکومت نے یہ ٹیکس لگانے کا اختیار پارلیمان سے سنٹرل بورڈ آف ریونیو کو منتقل کر دیا ہے۔

بجٹ پہلے سے مختلف نہیں' لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں عام لوگوں پر ۲۸ ارب روپے کے نئے بالواسطہ ٹیکسوں کا جو کمر توڑ بوجھ ڈالا گیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن ٹیکسوں کا یہ بوجھ معاشی ترقی کی اسی فکر اور ماڈل کا منطقی نتیجہ ہے جو ہر بجٹ سازی میں رہنما رہا ہے' اور اس بوجھ کو آج یا کل قوم پر پڑنا ہی تھا۔ ہمیں یہ پیش گوئی کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ آنے والے ہر سال میں خوف و حزن میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا' اور ٹیکسوں میں بھی۔

پاکستان آزاد ہوا' تو یہاں کے حکمران ترقی کی اس سوچ اور ماڈل پر دل و جان سے فریفتہ تھے ۵
جو انھوں نے مغرب میں دیکھا تھا۔ مغرب میں ۳۰ کے عشرہ کی عظیم کساد بازاری کے بعد سے ۶۰ ۲۰
کے عشرہ تک' ترقی کے بارہ میں جس فکر کا سکہ چلتا رہا وہ یہ تھی:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱- معاشی ترقی ہی' ہر قسم کی ترقی' بلکہ مکمل انسانی زندگی کی ترقی کا نام ہے۔

۲- معاشی ترقی کا راز تیز سے تیز تر صنعت کاری میں پوشیدہ ہے۔

۳- تیز سے تیز صنعت کاری کی اصل کلید سرمایہ ہے۔

۴- یہ سرمایہ ہر طرح کے بالواسطہ اور بلا واسطہ ٹیکس لگا کر اور بچتوں سے حاصل کرو۔ زراعت کے وسائل بھی صنعت کاری کی طرف منتقل کرنے میں تامل نہ کرو۔ ٹیکسوں سے نہ ملے تو قرضے لو' اندر سے بھی اور بیرون ملک سے بھی' جتنے' جہاں سے' اور جن شرائط پر مل جائیں۔

۴۰ اور ۵۰ کے عشروں میں مقبول' ترقی کا کیمبرج ماڈل اسی مفروضہ پر بنا تھا کہ جتنا سرمایہ لگایا جائے گا' اتنی ہی پیداوار بڑھے گی۔ روزینس ٹائن - روڈان نے یہ بات یوں کہی "ایک بڑے دھکے کی ضرورت ہے' اس سے معیشت ایک خود کفیل صنعت کاری اور سریع ترقی اور نشوونما کے مقام پر پہنچ جائے گی"۔ (ورلڈ ڈیویلپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۱' ص ۴' ۳۱' ۳۵)

خود مغرب میں اس فکر میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ لیکن جس طرح ہمارے ہاں نئی سائنس مغرب سے ۵۰ سال بعد پہنچتی ہے' ترقی کے نئے نظریات بھی ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یا کم سے کم حکمرانوں کو پتا نہیں چل سکا ہے۔ پہنچ بھی جائیں تو ۴۰ سال تک مغربی ماڈل کی اندھا دھند پیروی کے زہریلے پھلوں اور کانٹوں سے ہم کو یکایک نجات نہ ملے گی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ماڈل مغرب کا تھا' عملی جامہ پہنانے والے "مشرق" کے وہ جاگیردار اور سرمایہ دار رہے ہیں جو وہاں کے اخلاق و کردار اور دیانت سے بھی خالی ہیں۔ چنانچہ اس ماڈل سے اگر کچھ نفع ہو سکتا تھا' وہ بھی ہمیں نصیب نہ ہوا۔ آج بھی سیاسی و معاشی فیصلہ سازی کے مختار وہی لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے بددیانتی کی جو چھلنیاں لگا دیں' ان کی وجہ سے سرمایہ کاری سے پیداوار میں جو اضافہ ہو سکتا تھا وہ بھی نہ ہوا' اور قرضوں اور ٹیکسوں کا بیشتر حصہ لوٹ کھسوٹ اور اسراف کی نذر ہو گیا۔ اور اب ان چھلنیوں سے مسندِ اقتدار پر بیٹھے وہ لوگ کیسے دست بردار ہوں جن کی جیبوں ہی میں چھن چھن کر سب کچھ پہنچ رہا ہے۔ مغرب میں سوچ اس لیے بدلی کہ ان کی توقعات کے مطابق ان کے ماڈل سے غربت کم نہ ہوئی۔ لیکن ہمارے فیصلہ ساز جب دیکھ رہے ہیں کہ یہ نسخہ ان کو امیر سے امیر تر بنا رہا ہے' تو وہ اسے کیوں تبدیل کریں۔

سرمایہ اور قرضوں پر ترقی اور ملک چلانے کو منحصر کر دینے کی وجہ سے آج ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اپنی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ نہ دفاع پر خرچ کر رہے ہیں' نہ معاشی ترقی پر' نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عوام کی فلاح پر' بلکہ صرف سود اور قرض چکانے میں لگا رہے ہیں۔ اس سال کی متوقع آمدنی ۲۳۷ ارب ہے۔ اب اس میں سے ۱۳۶ ارب روپے (۵۸ فی صد) قرضوں کی خدمت میں جائیں گے۔ قرضوں کے ساتھ اگر ہم دفاع کے ۱۰۲ ارب بھی ملا لیں' تو ساری آمدنی ختم ہو جائے گی۔ اگر حکومت مزید قرضے نہ لے' نہ نئے ٹیکس لگائے' تو ہمیں کسی اور چیز پر خرچ کرنے کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔

آج ہم لگ بھگ ۱۴۰۰ ارب کے مقروض ہیں' ۷۰۰ ارب کے اندرونی قرضے' ۷۰۰ ارب کے بیرونی۔ یہ قرضے تقریباً ہماری مجموعی قومی پیداوار (G D P) کے برابر ہیں۔ گویا ہر بچہ پیدا ہوتا ہے تو ۱۲ ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے۔ قرضوں کے بوجھ میں اضافہ کی رفتار بھی دیکھیے۔ ۱۹۸۱ میں اندرونی قرضے صرف ۵۸ ارب تھے' ۱۳ سال میں وہ ۱۲ گنا بڑھ کر ۷۰۰ ارب ہو گئے۔ چار سال پہلے ۱۹۹۰ میں بھی یہ ۳۸۱ ارب تھے۔ بیرونی قرضے اس رفتار سے تو نہیں بڑھے' کہ ان کو بڑھانا ہمارے حکمرانوں کے بس میں نہ تھا' لیکن ۱۹۸۱ کے ۸٫۷ ارب ڈالر' ۱۹۹۴ میں ڈھائی گنا بڑھ کر ۲۰٫۳ ارب ہو گئے۔ ایوب خاں کے "سنہری دور" میں' ۱۹۶۰ کے ۱۴۵ ملین ڈالر کے قرضے دس سال میں ۲۰ گنا بڑھ کر ۳ ارب ڈالر (۱۹۷۰) ہو گئے تھے۔

یہ قرضے صرف معاشی ترقی کے لیے نہیں لیے گئے۔ کچھ وسائل کی کمی' لیکن بیشتر اسراف' لوٹ کھسوٹ اور ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے ہم نے مسلسل اپنے وسائل سے زیادہ خرچ کیا' اور خسارے پورا کرنے کے لیے مزید قرضے لیے۔ پرانے قرضے ادا نہ کر سکے' تو انھیں ادا کرنے کے لیے بھی پھر نئے قرضے لیے۔ قرض لے کر خسارہ پورا کرنا' اور سود پر قرض لے کر قرض بمع سود ادا کرنا' یہ ایسا چکر ہے جس کا نتیجہ روز بروز بڑھتے ہوئے مزید قرضوں کے بوجھ' مزید خسارے' مزید نئے ٹیکس اور مزید کمر توڑ گرانی کے سوا کچھ نہیں۔ اگلے سال میں ہم ۸۲ ارب کے بیرونی قرضوں کی امید لگائے ہوئے ہیں' اس میں سے ۵۳ ارب سود اور قرض کی ادائگی میں واپس چلے جائیں گے۔

قرضے اور ان میں اضافہ کی اس ہوش ربا رفتار میں کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ حالیہ بجٹ میں خسارہ ۴۵ ارب روپے دکھایا گیا ہے' جو قرضوں اور ٹیکسوں سے پورا کیا جانا پیشِ نظر ہے۔ لیکن اوّل تو آمدنی کے تخمینے خود مشکوک ہیں۔ ایک خبر کے مطابق خسارہ کم دکھانے کے لیے آمدنی کے تخمینہ میں ۱۴ ارب کا مصنوعی اضافہ کیا گیا ہے (فرنٹیر پوسٹ' ۱۰ جون ۱۹۹۴) ۔ آئی ایم ایف کے دباؤ سے درآمدات پر ڈیوٹیاں کم کرنے کے نتیجہ میں' دوسرے نقصانات سے قطعِ نظر'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آمدنی میں ۱۵ ارب روپے کی کمی یقیناً واقع ہو گی۔ لیکن جنرل سیلز ٹیکس اور دیگر ذرائع سے متوقع ۲۸ ارب ڈالر کی آمدنی کی توقع ایک امید موہوم ثابت ہو گی۔ دوسرے' ۸۲ ارب کا مزید خسارہ بیرونی امداد کے خوش نما نام میں چھپایا گیا ہے۔ اعلان کیا گیا ہے کہ ہم ۱۵ ارب سے زیادہ اندرونی قرضے نہیں لیں گے۔ اس کی بھی پابندی نہیں ہو گی۔ اس طرح کل خسارہ کم سے کم ۱۴۱ ارب کا ہے۔ یہ ٹیکسوں سے جتنا وصول ہو جائے' باقی قرضے لے کر ہی پورا کیا جائے گا۔

یہ سب قرضے ہر سال "خدمت" کا تقاضا کریں گے۔ سب سے بڑا بوجھ سود کا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ساری نقد آمدنی سود میں دے کر بھی جان نہ چھوٹے گی۔ ۹۵ - ۱۹۹۴ میں قرضوں کی "خدمت" میں ۱۰۳ ارب کا سود بھی شامل ہے۔ ۸۳ ارب اندر کا' ۲۰ ارب باہر کا۔ سود کی اس رقم کے مقابلہ میں معاشی ترقی کے لیے صرف ۹۰ ارب اور دفاع کے لیے ۱۰۲ ارب دستیاب ہیں۔ ۱۹۸۴ میں دفاع کے ۳۲ ارب اور ترقیاتی خرچ کے ۳۳ ارب کے مقابلہ میں سود کے ۱۲ ارب تھے۔ اب صورتِ حال الٹ گئی ہے۔ سودی قرضوں کا کاروبار تو معاشی ترقی کے نام پر ہی شروع ہوا تھا' لیکن ۱۹۸۸ سے مسلسل ہم معاشی ترقی پر جتنا خرچ کر سکتے ہیں اس سے زیادہ قرضوں کی خدمت پر خرچ کرنا پڑا ہے۔ اب قرضوں اور سود کی ادائیگی کا یہ بوجھ ہر سال بڑھتا جائے گا' جب تک سوچ' پالیسیوں' اقدامات اور کردار میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آتی۔

سود کو تجارت قرار دے کر' اور علانیہ حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کر کے' ہم پر ہر وہ وعید صادق آ رہی ہے جو اللہ نے ہم کو سنائی ہے۔ سود جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے' دولت اور آمدنی اس سے کہیں زیادہ تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ یمحق اللہ الربوٰ کے یہی معنی ہیں۔ اس شخص کی طرح جس سے شیطان لپٹ گیا ہو' ہمارے حکمرانوں کے حواس خبط ہو چکے ہیں' انھیں اپنے برے بھلے کی تمیز نہیں رہ گئی ہے' وہ اندھا دھند آئی ایم ایف کے "سنہری بچھڑے" کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ کے نتیجہ میں اور کیا بھگتنا ہو گا' یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

۱۹۸۴ میں دفاعی بجٹ' حکومتی اخراجات کا تقریباً نصف' یعنی ۳۲ ارب روپے تھا۔ حالیہ بجٹ میں رقم تو ۱۰۲ ارب ہو گئی ہے' لیکن تناسب تقریباً ۳۵ فیصد ہو گیا ہے۔ پاکستان کو درپیش خطرات کی بنا پر' اس بات میں بڑا وزن ہے کہ اس بجٹ میں اضافہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دفاع کے بارہ میں ہمارے ہاں صحت مند' غیر جذباتی اور تعمیری مباحثہ کی روایت بالکل مفقود ہے۔ اس ضمن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب چند سوالات پر ایسے مباحثہ کا آغاز ہونا چاہیے۔

ایک یہ کہ کیا آج کے زمانے میں صرف اسلحہ اور قوم کے وردی پوش حصہ کے بل پر ملک کا دفاع ممکن ہے ؟ جس قوم کو تعلیم، صحت، غذا اور جذبوں اور کردار کی تعمیر فراہم کرنے کے لیے کچھ نہ کیا جا رہا ہو، کیا وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے ؟ کیا پوری قوم کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنی تعمیر اور حملہ آور کے خلاف مزاحمت کے لیے تیار کرنا اور جذبۂ جہاد سے سرشار کرنا ضروری نہیں ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حکمراں خود ایک ایسی قوم کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوں ؟ اگر ضروری ہے تو اس بارہ میں ہم کیا کر رہے ہیں، اور ہمارے بجٹ میں کیا تجویز کیا گیا ہے ؟ ہمیں کوئی ایسی مد نظر نہیں آئی جو اس اہم ترین ضرورت کو پورا کرے۔ دوسرے یہ کہ دین، کلچر، کردار، تعلیم اور صحت کی ضروریات قربان کر کے اگر ہم اپنے دفاع پر ۵۰ فی صد تک بجٹ خرچ کرتے ہیں، تو ملک کی سلامتی کے لحاظ سے اس کا حاصل کیا رہا ہے ؟ تیسرے یہ کہ اگر دفاع کا انحصار بھی بیرونی طاقتوں کی امداد اور ان کی خوشنودی پر ہے، تو کیا ہماری فوج، کشمیر، نیوکلیر پروگرام، داخلی انتشار، جیسے اہم مسائل پر قومی مفادات کی حفاظت کے لیے جرات سے کھڑی رہے گی؟

ہمیں افسوس ہے کہ ماضی کے بجٹوں کی طرح ہمارے حالیہ بجٹ میں بھی قرضوں اور سود کے اس جال سے نکلنے، اور دفاع کے خطیر اخراجات پر معقول پالیسی وضع کرنے کے لیے کسی سوچ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

سب جانتے ہیں کہ لوگ ٹیکس نہیں دیتے۔ مگر کیوں نہیں دیتے؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر ملک کو ترقی کرنا ہے، تو ملک کے لوگوں کو حکومت کو مالی وسائل فراہم کرنا ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے ٹیکس بھی لگانا ہوں گے۔ لیکن باشندوں پر ٹیکس لگا کر وسائل جمع کرنے میں چند بنیادی مسائل حائل ہیں۔ ایک یہ کہ کون کتنا ٹیکس دے، یعنی مختلف حیثیت کے لوگوں کے درمیان ٹیکسوں کے بوجھ کی تقسیم کا منصفانہ نظام کیا ہے ؟ دوسرے کن چیزوں پر ٹیکس لگتا ہے، اور کن پر نہیں لگتا ؟ تیسرے یہ کہ ٹیکس کس طرح وصول کیا جاتا ہے ؟ چوتھے کہ یہ ٹیکس کس طرح خرچ کیا جاتا ہے؟ لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کی خالی مزید جیبیں خالی کی جاتی ہیں، بھری جیبیں ابل رہی ہوتی ہیں۔ ان کی ضرورت کی چیزوں پر ٹیکس لگتا ہے، امیروں کی بے تحاشا آمدنی پر نہیں۔ ٹیکس سے یا قرض ادا ہوتے ہیں، یا دفاع، یا حکومتی عہدیداروں کی شاہ خرچیاں۔ پھر وہ ٹیکس کیوں دیں!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے ان مسائل کا اپنے بجٹ میں سرے سے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا ہے۔ بلکہ ان کو بالکل نظرانداز کر کے ۲۸ ارب کے نئے بالواسطہ ٹیکسوں کا بار ڈال دیا ہے' اور پرانے ٹیکسوں کے نظام کو زیادہ کارگر بنانے کے لیے چند خون خشک کرنے والی (draconian) تجاویز پیش کر دی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بنیادی مسائل حل کیے بغیر' نہ مطلوب تعداد میں ٹیکس دہندگان کی صورت نظر آئے گی' نہ مطلوب مقدار میں ٹیکسوں کی امید بر آئے گی۔ صرف وہی مچھلیاں جال میں پھنسیں گی جو مجبور اور بے بس ہوں گی۔

دنیا میں کوئی بھی خوشی خوشی اپنی کمائی حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھماتا' ہر جگہ ٹیکس چوری ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان جیسے ملکوں میں جس پیمانہ پر یہ کام ہوتا ہے' اس کے ساتھ ملک کا ترقی کرنا ممکن نہیں۔ کراچی کے اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ کمپنیوں میں صرف ۲۵ فی صد ٹیکس دہندگان ہیں۔ صرف ۲۰ نے گذشتہ سالوں میں مسلسل ٹیکس دیا ہے۔ سابق وزیر اعظم نے خود حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ۳۰۰ ٹیکسٹائل ملیں صرف ۱۴ کروڑ ٹیکس دیتی ہیں۔ شخصی طور پر ٹیکس دہندگان کی تعداد صرف ۱۱ لاکھ ہے۔

ٹیکس نادہندگی کی سب سے اہم وجہ ٹیکس کی وصولی کا نظام ہے' جو سرتا سر رشوت' جھوٹ' دھوکہ اور ظلم و جور پر مبنی ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ٹیکس کا ایک تہائی حصہ ٹیکس افسران ہڑپ کر لیتے ہیں' ایک تہائی بزنس مین اپنے پاس رکھتا ہے' اور صرف ایک تہائی حکومت کے خزانہ تک پہنچتا ہے۔ شریف آدمی جو ایمانداری سے ٹیکس ادا کرنا چاہے وہ تو انکم ٹیکس آفیسر کے پاس اپنا صحیح گوشوارہ لے جانے سے بھی لرزتا ہے۔ ٹیکس اسلام کی رو سے ناجائز نہیں' لیکن وصولی کا یہ نظام اتنے مفاسد کا دروازہ کھولتا ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ سدّباب ذریعہ کے اہم تشریعی اصول کے تحت کسی شرعی عدالت کو اسے خلافِ اسلام قرار دینے میں تامل نہ ہو گا۔

براہِ راست ٹیکس یا تو مجبور' متوسط' ملازم پیشہ طبقہ دیتا ہے' یا وہ کمپنیاں اور افراد جو کسی طرح بھی اپنی آمدنی چھپا نہیں سکتے' نہ انکم ٹیکس افسر کو راضی کر سکتے ہیں۔ اس طرح صرف متوسط طبقہ کا پیسہ اس سے گھسیٹا جاتا رہتا ہے۔

اس کا حل حکومت نے یہ نکالا ہے کہ طرح طرح کے بالواسطہ ٹیکس لگاؤ۔ جہاں آدمی کچھ بھی خرچ کرے وہیں ٹیکس لگا دو۔ وہ ٹیکس دیے بغیر ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرنے پائے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ سانس لے تو ٹیکس دے' کھڑکی کھولے تو ٹیکس دے۔ طرح طرح کے سرچارج' اور اب سیلز ٹیکس' اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ بالواسطہ ٹیکس کا بار بظاہر امیر اور غریب پر یکساں پڑتا ہے'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن غریب نقصان میں رہتا ہے' امیر فائدہ میں۔ غریب جو بالواسطہ ٹیکس دیتا ہے اس میں اس کی آمدنی کا بڑا حصہ چلا جاتا ہے۔ امیر بھی غریب کے برابر ہی دیتا ہے' جو اس کے لیے دھیلا برابر قیمت نہیں رکھتا۔ اور اس طرح بھی امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ بالواسطہ ٹیکسوں کا تناسب پہلے ہی زیادہ تھا' اس بجٹ کے نئے ٹیکسوں کے بعد یہ تناسب ۸۰ فی صد ہو جائے گا۔ بالواسطہ ٹیکسوں سے گرانی میں بے تحاشا اضافہ ہو گا۔ اس گرانی کا شکار صرف غریب اور متوسط طبقہ ہو گا۔ امیر کو کیا فرق پڑتا ہے' وہ بلا تکلف خرچ کیے چلا جائے گا۔

جب ٹیکس دینے والا خرچ کرنے والے حکمرانوں کو اس کا پیسہ اپنی شاہ خرچیوں میں بے دردی سے لٹاتے دیکھتا ہے' تو اس کا دل کس طرح ٹیکس دینے پر آمادہ ہو: مرکزی انتظامیہ پر ۲۰ ارب روپے خرچ ہوں گے' ۱۹۸۴ میں یہ ۴ ارب تھے۔ پنجاب کی انتظامیہ کا خرچ ایک سال میں ۶۰ فی صد بڑھ کر ۸۳۴ ارب ہو جائے گا' لیکن امن و امان پر' جس کے فقدان نے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے' خرچ میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ۹ ماہ میں اپنے گھر اور دفاتر کی تزئین نو پر ۷۶ لاکھ روپے خرچ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ نجی دوروں پر' افسران کے علاج معالجہ پر' وزرا و افسران کے مکانات' گاڑیوں اور ٹیلیفون بلوں پر' صدر پاکستان کے نجی دوروں پر' وہ امریکہ جائیں یا شکار پر' کروڑوں روپے کے خرچ اس کے سامنے ہیں۔

ہمیں امید نہیں کہ ہمارے خرچ کرنے والوں کے دلوں میں یہ خیال کبھی دور سے بھی پھٹکتا ہو گا کہ بیت المال سے خرچ کے بارہ میں اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کو یہ بتانے میں کوئی ہرج نہیں کہ مسلمان کے لیے عوام کا مال' مال یتیم کی طرح ہونا چاہیے۔ جو خود غنی ہے وہ نہ لے' اور جو محتاج ہے وہ بقدرِ ضرورت لے لے۔ جو یہ مال ناجائز کھاتا ہے' وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے۔ جن ممالک کی ترقی پر ہم فدا ہیں' ان کے ہاں بھی کوئی پبلک عہدے دار اگر سرکاری گاڑی ہی ذاتی استعمال میں لے آئے تو اسے اس کے اخراجات ادا کرنا ہوتے ہیں۔ اگر لوگ ان "مغربی" اخلاقی معیارات کی عشرِ عشیر پابندی بھی دیکھیں گے تو وہ یقیناً ٹیکس دیں گے۔

جس وسیع پیمانہ پر سیلز ٹیکس لگایا گیا ہے اس سے نہ صرف عام ادمی کی زندگی اجیرن ہو جائے گی' بلکہ اس کے طریق کار میں اس کی ناکامی مضمر ہے۔ کینیڈا میں ایسے ٹیکس کے اطلاق سے پہلے لوگوں کو دو سال تربیت دی گئی تھی۔ امریکہ میں آج تک اس قسم کا نظام نافذ نہیں کیا گیا ہے۔ برطانیہ اور یورپی ممالک جیسا وی اے ٹی کا نظام ہمارے ہاں چلنا ناممکن ہے' جہاں حساب کتاب رکھنے کا کوئی رواج نہیں' بدعنوانی اور رشوت عام ہے سوپ پولیس اور ٹیکس جیسے محکموں کے پاس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی پھٹکنے سے دور بھاگتے ہیں۔ سیلز ٹیکس ہوں' پرانے ٹیکس جمع کرنے کے نئے طریقے ہوں' باہر سے آنے والے ہر مسافر کے سامان پر ٹیکس ہو' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ساری تدابیر صرف رشوت خوری کو آسمان تک لے جانے کا ذریعہ بنیں گی۔

مغرب کے ترقیاتی ماڈل میں زراعت کو نظرانداز کر کے' یا اس سے پیسہ کھینچ کر بھی' صنعتی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کا تصور موجود تھا۔ اس لیے ہمارے لیڈر شروع سے پسماندہ زراعتی معیشت کو چمکتی دمکتی صنعتی معیشت میں بدلنے کے لیے بے چین رہے ہیں۔ آب پاشی کا نظام تباہ ہو رہا ہے' فصلیں کاشت کرنا گراں سے گراں تر ہو رہا ہے۔ ہماری زراعت کی زبوں حالی کا اندازہ بھارتی پنجاب کی زراعت سے موازنہ کر کے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔

اس بجٹ کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ "انسان کی ترقی" پر' اس کی فلاح و بہبود کا اہتمام کرنے پر' اس کو اعلیٰ معیار کی زندگی سے ہم کنار کرنے کے لیے' اور اس کو تعلیم اور صحت جیسی سماجی خدمات فراہم کرنے پر وسائل لگانے سے اسی طرح مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے جس طرح ہر بجٹ میں برتی چلی آرہی ہے۔ مروجہ اور معیار و نتائج کے لحاظ سے انتہائی ناقص تعلیم اور صحت کے لیے وسائل کا تناسب اسی طرح برائے نام ہے جس طرح چلا آرہا ہے۔ ہم کو اس کی تو کوئی امید نہیں کہ ہمارے بجٹ ساز حکمرانوں کو اس بات کا احساس بھی ہو گا کہ دستور کے لحاظ سے یہ ان کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ پاکستان کے باشندوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس لیے اگر اربوں کھربوں کے بجٹ میں ہمیں اس فریضہ کے لیے کسی رقم کا دور دور کوئی سراغ نہیں ملا تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہوا۔ (پنجاب کے ۷۲ ارب کے بجٹ میں "مذہبی امور" کے تحت ۴۴ لاکھ کی "خطیر" رقم ضرور رکھی گئی ہے)۔ ہم ان کو دین اور دستور کے لحاظ سے توجہ ضرور دلاتے لیکن بھینس کے آگے بین بجانے کا کوئی حاصل نہیں۔

ہاں' ہم اس باب میں ان کے بجٹ کا جائزہ' ترقی کی راہِ سلوک میں ان کے مرشد اور امام' ورلڈ بنک کے ارشادات کی روشنی میں لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس حوالہ سے شاید وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ بنک کی "ترقی کے چیلنج" کے عنوان سے' ورلڈ ڈیویلپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۱ کے مطابق' ترقی کے وہ مغربی نظریات "وقت کی کسوٹی پر ناکام ثابت ہوئے" جن کے پیچھے ہمارے حکمران اب تک دیوانے ہیں۔ (اخبار گارجین کے مطابق "ترقی کی دوڑ کے ۳۰ سال' ترقیِ معکوس کے تیس سال ثابت ہوئے")۔ چنانچہ ان نظریات میں گذشتہ ۴۰ سال میں "بنیادی تبدیلیوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک سیلاب" امنڈ آیا ہے۔ "وہ نظریات جو کل عقلِ کُل سمجھے جاتے تھے ' اور جو حکومتوں اور اداروں کے ترقی کے باب میں رہنما تھے ' وہ اب اٹھا کر ایک طرف رکھ دیے گئے ہیں"۔

خیال تھا کہ معاشی ترقی ہی پوری زندگی کی مکمل ترقی کا پیمانہ ہے' معلوم ہوا کہ "انسان کی ترقی" معاشی ترقی سے مختلف اور کہیں وسیع تر چیز ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات سمجھتے تھے کہ فی کس آمدنی (PCI) میں اضافہ' ترقی کے تمام دیگر پہلوؤں کے لیے سب سے اچھا پیمانہ ہے' معلوم ہوا کہ یہ پیمانہ ناکافی بھی ہے' اور فریب کار بھی' "یہ غریبوں کی بڑی بڑی آبادیوں کی فلاح و بہبود میں حقیقی تبدیلی واقع نہ ہونے پر نقاب ڈال دیتا ہے"۔ "ترقی صرف آمدنی میں اضافہ سے نہیں ناپی جا سکتی۔ اس میں' ذریعہ کے طور پر نہیں مقصد کی حیثیت میں' بہتر تعلیم' بہتر صحت کے معیار' بہتر غذا' کم غربت' پاکیزہ ماحول' مساوات' انفرادی آزادی اور لذت بخش کلچرل زندگی بھی شامل ہیں"۔

خیال تھا کہ اعداد و شمار سے سب کچھ پتا چل جاتا ہے' معلوم ہوا کہ "بنیادی ضروریات ---- غذا' تعلیم' صحت' [وغیرہ] ---- کا احاطہ اعداد و شمار کر ہی نہیں پاتے"۔ خیال تھا کہ معاشی ترقی کی کلید صنعتوں میں سرمایہ کاری ہے' معلوم ہوا کہ "اگر لوگوں (کی ترقی اور بہبود) میں سرمایہ کاری کی جائے' تو پائیدار ترقی کے لیے سب سے مضبوط بنیاد فراہم ہوتی ہے"۔ "معاشی ترقی کے لیے پیداوار میں اضافہ ضروری ہے۔ لیکن پیداوار میں اضافہ کیسے ہوتا ہے؟" اب نظریہ یہ ہے کہ تاریخ ' کلچر' تعلیم ' اداروں ---- سیاسی' معاشی' رواتی' خاندانی ---- اور پالیسیوں کو پورا رول دیے بغیر ٹیکنولوجیکل ترقی ممکن نہیں' اور اس کے بغیر پیداوار میں اضافہ ممکن نہیں۔

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی ترقی ہی ---- جس میں اس کی کلچرل ترقی شامل ہے' اور کلچر نام ہے فکر' عقیدہ' مذہب' روایات' آداب' کردار' تاریخ کا ---- کلید ہے معاشی ترقی کی۔ غربت کے ازالہ کے لیے پائیدار حکمتِ عملی کی دو بنیادیں ضروری اور اہم ہیں : ایک' غریب کے پاس جو سرمایہ وافر مقدار میں موجود ہے ---- یعنی اس کی محنت مزدوری ---- اس کا پیداوار کے لیے بھرپور استعمال' (نہ کہ سرمایہ کا)۔ دوسرے غریب کو تعلیم' صحت' غذا اور بہتر معیارِ زندگی کی نعمتیں فراہم کی جائیں۔ گویا طویل المیعاد تیز تر ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ترقی کا وہ نقشہ اختیار کیا جائے جس کی بنیاد انسانی محنت کے استعمال پر ہو' اور جس میں غریب کے اندر جو "انسان" ہے اس کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کیے جائیں۔

اسلام کی بات تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی' لیکن ہمارے بجٹ ساز اگر اپنے ہی ترقی اور معاشی ترقی کے اہداف کے بارہ میں سنجیدہ اور مخلص ہیں' تو پاکستان میں بسنے والے مسلمان انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عقائد، ایمان، روایات اور کلچر کی ترقی، اس کی فلاح و بہبود میں اضافہ، اس کو تعلیم، صحت، رہائش جیسی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے کثیر وسائل لگانے میں ان کی غفلت اور بخل ناقابلِ فہم بھی ہے، اور ناقابلِ تلافی جرم بھی۔ اس غفلت اور بخل پر ان کا پورا بجٹ گواہ ہے۔

اس بجٹ کو بنانے میں ہمارے حکمرانوں کی غلامانہ سوچ کا بھی دخل ہے، اس لیے کہ آغاز ہی سے ایسا ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب تو یہ "راز" ہر زبان پر ہے کہ ہماری حکومتیں اپنی معیشت کو چلانے، اپنا بجٹ بنانے، اپنے اہداف مقرر کرنے کا مکمل اختیار آئی ایم ایف کے پاس رہن رکھ چکی ہیں۔ پاکستان نے اس ادارہ کی وہ شرائط اس طرح دم ہلا کر قبول کی ہیں جس طرح دنیا کے کسی دوسرے ملک نے نہیں کیں۔ انھوں نے پنسل سے بجٹ بنایا، ہمارے بجٹ سازوں نے اسے قلم سے لکھ دیا ہے۔ وہ قرض خواہ اور سرمایہ دار ملکوں کے نمایندے ہیں۔ ان کی دلچسپی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سرمایہ اور ان کی پیداوار کے لیے منڈیاں ملیں۔ ان کے سرمایہ کے لیے ہمارا ملک پہلے ہی منڈی ہے۔ ان کو صرف یہ فکر ہے کہ قرض بمع سود ادا ہوتے رہیں۔ اور اب درآمدات پر ڈیوٹیاں بتدریج ختم کر کے ان کی پیداوار کے لیے بھی، ہمارا ملک منڈی بن جائے۔ بجٹ کی ہر شق آئی ایم ایف سے معاہدہ کے مطابق ہے۔ چنانچہ غریب پستے رہیں گے، ملک بدحال رہے گا، حکمران سنہری زنجیریں پہنے خوش خوش دادِ عیش دیتے رہیں گے۔

قوم کا مقدر یہی بجٹ رہیں گے، جو صرف قرض خواہوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہر سال نئے نئے ٹیکس لگاتے رہیں گے، جب تک کہ قوم اٹھ کھڑی نہ ہو اور اپنے تہذیبی، سیاسی اور معاشی فیصلے کرنے کا اختیار ایک "عام مسلمان" کی طرف نہ لوٹا دے۔ وہ عام مسلمان جو مغرب، امریکہ، آئی ایم ایف، اور اپنے ملک کے جاگیردار اور سرمایہ دار کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکے، اور جو اپنی ترجیحات اور اقدامات کا یقین حکمرانی کے اس نظریہ پر استوار کرے جس کا اعلان حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یوں کیا تھا:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٹیکس کلکٹر نہیں، ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے"۔

© rasailojaraid.com